نعیم احمد

فکر غالب ---- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی نظر میں

(یہ مقالہ مرحوم خلیفہ عبدالحکیم کی برسی فروری ۱۹۹۸ء پر پڑھا گیا۔ ڈاکٹر نعیم احمد شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی کے سربراہ ہیں)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے وطن عزیز میں فلسفہ و تصوف کے گراں قدر علمی سرمائے کو متعارف کرانے کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں ہیں، انہیں اہل علم نے سراہا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اسلام کے فقہی اور کلامی مسائل پر اپنے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی، بلکہ تصوف و عرفان کے اسرار و رموز کی بھی اچھوتے انداز سے تشریح و توضیح کی۔ فلسفہ و کلام اور تصوف کے ساتھ ساتھ خلیفہ صاحب کو شعر و ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور دیگر شعرا کے نقاد بھی۔ "حکمت رومی" میں انہوں نے فلسفیانہ مہارت کے ساتھ مولانا رومؒ کے اشعار فکری پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کے بعد انہیں غالب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کی تصنیف "افکار غالب" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں انہوں نے کلام غالب کی تشبیہوں، استعاروں، علامتوں، رمزوں اور کنایوں میں فلسفہ و تصوف کے موتیوں کا سراغ لگایا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کے خیال میں غالب نے کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام تو پیش نہیں کیا' تاہم اس کے کلام میں ہمیں فلسفیانہ رجحانات ضرور مل جاتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اپنی کتاب افکار غالب میں لکھتے ہیں:

"یہ امر بحث طلب ہے کہ غالب کا کوئی فلسفہ ہے یا نہیں۔ ہر بڑا فلسفی ایک نظام فکر مرتب کرتا ہے اور تمام اعیان و حوادث کو استدلال کی ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر جگہ علت اور معلول' مقدمات اور نتائج کی کڑیاں ملاتا ہے اور اس کے لیے سناعی ہوتا ہے کہ اس کے افکار میں ایک اساسی توافق ہو' تاکہ اس پر تناقض کا الزام عائد نہ ہو۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غالب کا کوئی فلسفہ بھی تھا۔ ہاں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس قسم کے فلسفیانہ افکار کا اس کے کلام میں غلبہ نظر آتا ہے۔ اس نے خود کوئی فلسفہ پیدا نہیں کیا۔" (ص ۲۴ و ۲۶)

غالب کی اصل حیثیت نہ صوفی کی ہے اور نہ روایتی فلسفی کی۔ وہ شاعر ہے اور کائنات کو فنکارانہ نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب ایسا فنکار نہیں۔ جو صرف حسیات کی سطح تک ہی محدود رہتا ہو۔ اس کی ذہنی ساخت میں بلند پایہ مابعدالطبیعیاتی تفکر کا ایسا عنصر موجود ہے کہ بے اختیار اسے دنیا کے فلسفیوں کی صف میں شامل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مزید برآں اس کے اشعار کے فہم کیلئے بھی ذہن کی ایک مخصوص منطقی تربیت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایک شعر کے دو مصرعوں کے مابین ایسی غیر مرئی منطقی کڑیاں موجود ہوتی ہیں کہ ان کا ادراک کئے بغیر شعر کو کماحقہ' سمجھنا مشکل نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کو اس کے زمانے میں بعض لوگوں نے بے معنی شعر گوئی کا طعنہ بھی دیا تھا۔ فلسفیانہ تفکر کے علاوہ فکر غالب میں ایسے

متصوفانہ رجحانات بھی ملتے ہیں جن کا حصول تجربے کی بھٹی میں تپ کر ہی ممکن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب غالب کو تلمیذ الرحمٰن کا درجہ دیتے ہیں۔ یعنی اسے خدا سے براہ راست تلمذ حاصل تھا۔ لیکن جس طرح ماہرین طبقات الارض کو ایک ہی طبقہ ارض کا مشاہدہ کرتے ہوئے مختلف النوع تہیں ملتی ہیں، اسی طرح غالب کی ذہنی ساخت میں ہمیں فلسفہ، مابعدالطبیعیات، تصوف، مزاح، مقصد سے وفاداری، خودداری، اخلاقی بلندی، وسیع المشربی کے ساتھ ساتھ اخلاقی پستی، ابتذال اور فضول گوئی کی تہیں بھی ملتی ہیں۔ خلیفہ صاحب لکھتے ہیں:

> "اس کے کلام میں ہر قسم کا بلند و پست اور رطب و یابس موجود ہے۔ رندی و شاہد بازی بھی ہے اور عشق حقیقی بھی ہے اور عشق مجازی بھی ہے۔ دین کا احترام بھی ہے اور دین سے تمسخر بھی ہے۔ اپنی شراب خودی پر افسوس بھی ہے اور اس کا جواز بلکہ تفاخر بھی ہے۔ وہ بہ قول خود رہین عشق بھی ہے اور ناگزیر الفت ہستی بھی ہے۔ تسلیم و رضا کی تعلیم بھی ہے اور خدا کے ساتھ گستاخانہ شکایت اور جھگڑا بھی ہے۔ ہستی کو ہیچ بھی سمجھتا ہے لیکن اس کی ہر لذت کے پیچھے مجنونانہ انداز میں دوڑتا بھی ہے۔ بلند افکار اور پست خواہش اس کے کلام میں دست و گریبان ہیں۔"

کبھی زندگی کی بعض کیفیتوں پر ایسی حکیمانہ نگاہ ڈالتا ہے کہ اس کا ایک ایک شعر حکمت کا ایک دفتر معلوم ہوتا ہے۔ کفر و ایمان کی کوئی وادی نہیں جس میں اس کا گزر نہ ہوا ہو۔ وحدت الوجود کے مسائل اس بصیرت اور اس لذت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کائنات اس سے وجد میں آ جائے اور فرشتے گوش بر آواز ہو جائیں۔ تصوف میں ایسی بصیرت کا اظہار کرتا ہے کہ منصور (حلاج) کا

ثانی معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی جگہ اپنے مقابلے میں منصور کو بھی تنک ظرف قرار دیتا ہے۔ اس کا دماغ انسانی نفسیات کا محشرستان ہے اور اس کا یہ مصرعہ اس کی اپنی فطرت کا آئینہ ہے۔

ع قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

غم و اندوہ سے اس قدر زاری کرتا ہے کہ پتھروں کے دل پگھل جائیں، لیکن دوسری طرف غم و سوز اور درد و گداز کی ایسی مداحی کرتا ہے کہ مبداء فیاض نے اس سے اعلیٰ تر کوئی عطیہ انسان کو نہیں بخشا اور کہتا ہے کہ غم و اندوہ اور اضطراب کے بغیر حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اپنے آپ کو مسلمان نما کافر کہتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی نے شاعری کے متعلق کہا ہے کہ اس میں پیغمبری کا ایک جزو ہوتا ہے اور یہ کسی حد تک سچ بھی ہے۔ اگر اعلیٰ افکار اور جذبات کی تلقین پیغمبری کا ایک جزو ہے تو یقیناً یہ جزو غالب میں بھی مل جائے گا۔ اکثر اوقات ایسی باتیں کرتا ہے کہ معشرالانبیاء سے بھی ان کی داد مل جائے اور روح القدس بھی اس کا ہم زبان ہو جائے۔

ناقہ شوقم و جبریل حدی خوان من است

شاعروں کو تلامیذ الرحمٰن بھی کہا گیا ہے کہ انہیں براہ راست خدا سے تلمذ حاصل ہے۔ جب شاعر کو اعلیٰ حقائق کا وجدان ہوتا ہے جو اس نے کسی تعلیم و تلقین سے حاصل نہیں کیا، تو اس وقت وہ براہ راست مبداء فیاض سے فیض یاب ہوتا ہے۔ لیکن وہی شاعر ہوس پرستی اور ہوس انگیزی کی کیفیات میں تلمیذ الشیطان بھی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی خدا کا شاگرد بن جاتا ہے اور کبھی ابلیس کا چیلا! یہ سب رنگ آپ کو غالب میں ملیں گے۔"

(افکار غالب ص ص ۲۵، ۲۷)

خلیفہ صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس میں غالب کی بالکل صحیح تصویر

پیش کی ہے۔ شعراء کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں۔ یقولون مالایفعلون اور زندگی کی تمام وادیوں میں بغیر کسی مقصد کے بھٹکتے پھرتے ہیں' خلیفہ صاحب کے نزدیک یہ آسمانی فرمان غالب پر صادق آتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار بطور استثناء کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہو جاتا ہے جو شاعر ہونے کے باوجود لوگوں کی اخلاقی و روحانی راہنمائی بھی کرتا ہے۔

غالب جس شعری روایت کا امین تھا اس میں لفظ کو معنی پر اور طرز ادا کو طرز فکر پر ترجیح دی جاتی تھی۔ شاعری بالعموم زبان کی ظاہری زیب و آرائش' قافیہ ردیف اور وزن کے انتخاب اور لفظی رعایتوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بقول ریاض احمد جس طرح ایک پیشہ ور کوزہ گر مٹی کو اس طرح ڈھالتا ہے جس طرح اس نے اپنے استاد سے سیکھا تھا' اسی طرح شاعر الفاظ کے ذخیرے کو وزن اور قافیے ردیف کے سانچوں میں ڈھالتے چلے جاتے تھے اور اس بات سے بے نیاز تھے کہ جو شعر برامد ہوتے ہیں' اس پر روح انسانی کا کہیں پرتو ہے یا نہیں' اس ضمن میں وہ یوں بھی بے فکر تھے کہ جس طرح مٹی کے گھڑے اور صراحیاں بکتی تھیں' ویسے ہی ان کے شعر بھی چلتے تھے اور داد وصول کرتے تھے۔ ان سے کسی نے تبدیلی کا تقاضا کیا ہی نہیں' تو انہوں نے بھی عافیت جانی کہ بنے بنائے سانچوں کو توڑ پھوڑ کر ایسی تخلیق کی کیا ضرورت ہے جس کی منڈی میں مانگ ہی نہیں۔ گویا شاعر اور مشاعرے کے سامعین ایک غیر تخلیقی عمل کو تخلیقی عمل سمجھ کر اس پر خوش تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی زبان بھی بتدریج انحطاط پذیر ہوتی چلی گئی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے اردو زبان بڑی تیزی کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگی۔ لیکن اسے فارسی زبان کی بوسیدہ تراکیب' پامال لسانی سانچے اور مبتذل طرز اظہار وراثت میں ملے تھے۔ اس لیے اردو

شاعری پر ان تمام منفی روایات کی گہری چھاپ موجود تھی۔ صحیح بات یہ ہے کہ شاعری فکری عنصر کو نظرانداز کر کے تفنن طبع اور ذہنی عیاشی کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔ الفاظ سے کھیلنا' ذومعنی الفاظ کے استعمال سے جدت پیدا کرنا' ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھنا اور ردیف قافیہ اور وزن پر خصوصی توجہ صرف کرنا اس دور کی شعری روایت امتیازی نشان بن گیا تھا۔ ایسے میں غالب نے ایک نئی طرح ڈالی اور معنی کو لفظ پر فوقیت دی۔ وہ اپنے اردگرد کی شعری فضا سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہتا تھا بلکہ اپنے ان تصورات کے اظہار کیلئے شعر کو وسیلہ بناتا تھا جو اس کے تجربات و احساسات کی بھٹی میں تپ کر آنچ دینے لگتے تھے۔

"ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج"

لہٰذا وہ ان تصورات کے اظہار کیلئے زبان کے روایتی اسلوب کو یکسر نظرانداز کر کے ایسی تراکیب' تشبیہیں اور استعارے اختراع کرتا جو مروجہ لسانی ساخت میں بالکل اجنبی محسوس ہوتے۔ اسی لیے وہ جتنے شعر کہہ لیتا انہی پر اکتفا کرتا' اپنی غزلوں کے لیے زبردستی مطلع اور مقطع بنانے کی کوشش نہ کرتا حالانکہ اس کے لیے یہ چنداں مشکل کام نہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض قافیہ پیمائی کیلئے شاعری نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے تصورات کے ابلاغ کیلئے شعر کہتا تھا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اور اس ضمن میں روایت کے تتبع کو ضروری خیال نہیں کرتا تھا۔ اپنے افکار کے ابلاغ کیلئے وہ جہاں ضرورت محسوس کرتا زبان کے مروجہ سانچوں کو توڑ کر اپنی تراکیب' استعارے اور علامتیں وضع کرتا' پرانی تلمیحات کو بالکل

جدید تناظر میں پیش کرتا اور صاف اور سادہ طرز اظہار کی بجائے گنجلک اور پرپیچ انداز اختیار کرتا۔ اسی لیے اس کے زمانے میں لوگ اس پر طنز کرتے تھے۔

اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اپنی اس مشکل گوئی کو خود غالب نے بھی عیب نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک وصف سمجھ کر سراہا ہے۔

آگہی' دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے' اپنے عالم تقریر کا

عسیر الفہم اور گنجلک اشعار کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر' غالب نے برصغیر کی جامد فکری زندگی میں جو تحرک و تموج پیدا کیا' اس کا دو سطحوں پر جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک سطح پر اس نے اپنے ماقبل کی فکری روایات کو اپنی شاعری میں نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ منتقل کیا تو دوسری سطح پر آنے والے زمانے کی پیش بینی کی۔ اس لحاظ سے ہم غالب کو دو ادوار کی درمیانی کڑی قرار دے سکتے ہیں۔ غالب خود بھی اپنی اس حیثیت سے آگاہ تھا اور اپنے آپ کو "عندلیب گلشن ناآریدہ" کہتا تھا۔ مزید برآں اس کی جدیدیت پسندی کا ثبوت سرسید کی آئین اکبری کی تقریظ ہے جس میں اس نے تہذیب فرنگ کے روشن پہلوؤں کی تعریف کی ہے۔

مرحوم خلیفہ عبدالحکیم نے غالب کی اسی فکری اہمیت کے پیش نظر "افکار غالب" جیسی کتاب تحریر کی جس میں غالب کے حکیمانہ اور فلسفیانہ اشعار کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے فکر غالب کے اہم خدوخال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خلیفہ صاحب سب سے پہلے نظریہ وحدت الوجود کا ذکر کرتے ہیں جو کہ فکر غالب کا ایک بنیادی رجحان ہے۔ خلیفہ صاحب لکھتے ہیں:

"غالب کا حقیقی مذہب یا نظریہ حیات جسے اس نے اپنے وجدان اور تفکر سے اختیار کیا ہے وجود کی وحدت ہے... یہی مسئلہ ہے جس میں مابعد الطبیعیات اور تصوف کا موضوع مشترک ہو گیا ہے' سوائے تصوف کے اس پہلو کے جو عمل مجاہدہ' کشف اور تزکیہ نفس سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نظریہ کا مبحث یہ ہے کہ اصل ہستی یا ذات' واجب الوجود صرف ایک ہے۔ وجود کا اطلاق صرف اسی ایک ہستی پر ہو سکتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ہست نمانیست ہے۔ موجودات کی کثرت یا صفاتی ہے' یا اعتباری' خود ذات واحد میں جو کثرت صفات اور تنوع تجلیات ہے' اس کا تعلق ذات واحد سے کس قسم کا ہے' اس کی بابت صوفیاء اور حکماء میں طرح طرح کے اختلافات ہیں۔ موجودات کو اعتباری اور نیست کہنے کے باوجود بھی وجودی موحد اس بات کا قائل ہے۔ کہ جو کچھ بھی ہے وہ ایک ہی ذات کا جلوہ اور شہود ہے۔ لاموجود الا اللہ اور ولاموثر فی الوجود الا اللہ۔ اگر موجودات میں خدا ہی موثر فی الوجود ہے تو موجودات مطلقاً موہوم اور معدوم نہیں ہو سکتے۔ بقول غالب "اصل شہود و شاہد و مشہور ایک ہے۔"

(افکار غالب ص ۴۰)

وحدت الوجود کا نظریہ کسی ایک قوم یا سرزمین سے مخصوص نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر نظریہ ہے۔ مغرب میں اسے خالص فلسفیانہ سطح پر فلاطینوس (Plotinus) نے پیش کیا تھا۔ ہندوؤں میں یہ نظریہ ویدانت کہلایا۔ مسلمانوں میں بھی اس نظریہ کی صدائے بازگشت اکثر فلاسفہ اور حکماء کے افکار میں سنائی دیتی ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے توسط سے فلاطینوس کا تصور صدور (Emanation) تنزلات اور مدارج ہستی کے نظریے کی صورت میں

سامنے آیا۔ وحدت الوجود کی عالمی سطح پر کئی تعبیرات و تاویلات پیش کی گئیں۔ مسلمانوں میں بھی وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دو گروہ ہو گئے۔ اس مختصر نشست میں ان اختلافی بحثوں کو نہیں چھیڑا جا سکتا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ غالب کے نزدیک ہستی ایک کل ہے۔ اور اس کا اظہار متعدد اور متنوع شئون کی صورت میں ہوتا ہے۔

غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں وحدت الوجود کے مختلف پہلوؤں کی طرف نہایت بلیغ و لطیف اشارے کئے ہیں---- وحدت الوجود غالب کا اتنا پسندیدہ موضوع ہے کہ اس پر اس کے افکار کا احاطہ کرنے کیلئے شاید ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہو' تاہم ذیل میں چند ایک اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس کے تصور وحدت الوجود کا ایک سرسری سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہاں کھاؤ مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں نے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

غالب کہتا ہے کہ اصل توحید وہاں ہے جہاں تمام اضافتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔

نکو گوئے نکو گفت است در ذات
کہ التوحید اسقاط الاضافات

سمندر، اس کی لہروں، قطروں اور بلبلوں کی مثال بھی وحدت الوجود میں عام مل جاتی ہے جسے غالب نے یوں بیان کیا ہے۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
اس کے نزدیک خدا، کائنات اور انسان سب ایک ہیں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

بحر اور قطرہ و موج و حباب کے علاوہ غالب وحدت الوجود کا فلسفہ بیان کرنے کیلئے سورج اور ذرے کی مثال بھی دیتا ہے۔

ہے تجلی تیری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں
از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

پرتوسے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

غالب پر مسئلہ وحدت الوجود کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اس عقیدے کو اس نے کبھی شاعرانہ اور صوفیانہ رنگ میں بیان کیا ہے اور کبھی خالص فلسفیانہ انداز میں۔ ایک جگہ اس نے افلاطون کے اعیان ثابتہ کے وحدت الوجودی نظریہ کو خالصتہ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے جس کی تلخیص یوں ہے "اسماء نکرہ یا تصورات جنس و نوع بطور اعیان ثابتہ علم الٰہی میں ازلی اور ابدی طور پر پائے

جاتے ہیں۔ یہ اعیان خارج میں پوری طرح ظہور پذیر نہیں ہوئے۔ اشیاء اور حوادث کیلئے یہ مثل اعلیٰ ہیں۔ ہرعین یا اسم ایک نصب العین ہے جس سے موجودات بہرہ اندوز ہو کر وجود حاصل کرتے ہیں۔ تمام تغیر اس بہرہ اندزی کا شوق ہے۔ لیکن اعیان بطور نصب العین کے غیر تغیر ہیں۔" (افکار غالب ص ۶۳) غالب کے نزدیک بے صورت مادہ جو کہ عدم محض ہے' ایک ایسا ہیولی جس کے خالی صفحہ پر اعیان ثابتہ کے عکس سے صورتوں کے خدوخال ابھرتے ہیں۔

صور کون نقوش است و ہیولی صفحہ
صفحہ عنقا است چہ گوئی زنقوش والوان

لیکن جو صفحہ ہی عدم محض کے مترادف ہو' اس پر ابھرنے والے نقوش والوان کی حیثیت کیا ہو گی؟ یہی وجہ ہے کہ غالب کو کبھی تمام مظاہر کائنات' زمین آسمان چاند سورج ستارے سب کے سب ایک عظیم الشان التباس محسوس ہوتے ہیں۔

وہ بھی تھی اک سیمیائی سی نمود
صبح کو راز مہ و اختر کھلا

اور کبھی یہ سارا ہنگامہ وجود "پازیچہ اطفال" نظر آتا ہے اور وہ "اورنگ سلیمانی" کو محض ایک کھیل اور "اعجاز مسیحائی" کو صرف کہنے کی بات قرار دیتا ہے۔

خلیفہ صاحب کا خیال ہے کہ غالب وحدت الوجود کے عقیدے سے دو طرح کے احساسات رکھتا تھا۔ کبھی تو وجدانی طور پر اس پر یہ حالت طاری ہوتی تھی کہ وہ تمام اشیاء و افراد اور مظاہر کائنات کو غیر حقیقی اور وہمی سمجھنے لگتا۔ سارا عالم اسے سراب وجود نظر آتا اور وہ واقعات و حوادث کو غیر متعلق تماشائی

کی طرح دیکھتا۔ اور کبھی اسے گمان گزرتا کہ تمام مظاہر اور شئون دراصل حقیقت مطلقہ ہی کا اظہار ہیں۔ لیکن ان کی عارضی اور ہنگامی نوعیت سے اس کا ذہن تضاد و تناقض کا شکار ہوتا ہے اور وہ یہ سوال اٹھاتا ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اور

ہرچند کہیں کہ ہے نہیں

وحدت الوجود کا نظریہ جس مذہب اور قوم میں اپنایا گیا۔ اس سے بعض نتائج منطقی طور پر پیدا ہوئے۔ اولا اس سے شخص خدا (God Personal) کے تصور کی نفی ہوئی ہے۔ ثانیا اس سے جبریت (Determinism) کے عقیدے کو فروغ ملا ہے اور مذہب کے روایتی تصور اور سزا و جزا کے نظریہ کی تردید ہوئی ہے اور ثالثا اخلاقیات میں خیر و شر اور صائب و غیر صائب کے پیمانوں کو اضافی اور موضوعی قرار دیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب فکر غالب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ تینوں طرح کے منطقی نتائج غالب کی شاعری میں سامنے آتے ہیں۔

وہ مذہب کے معاملے میں وسیع المشرب ہے اور کسی خاص مسلک کا پابند نہیں

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہو گئیں

وہ کہتا ہے کہ بتکدہ ہو یا حرم' خدا کے احاطے سے تو باہر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا قدم بتکدے میں ہوا ور سرخدا کے آستانے پر ہو۔

ہم از احاطہ تست ایں کہ درجہاں مارا
قدم بہ بتکدہ و سر برآستانہ تست

اپنی شراب نوشی کے بارے میں کہتا ہے۔

دل اندوہ گیں و مے اندوہ ربا
چہ مے کردم اے بندہ پرور خدا

یعنی میرے دل کو اندوہ گیں اور شراب کو اندوہ ربا بنا دیا۔ اگر میں شراب نہ پیتا تو کیا کرتا۔ مرض اور دوا دونوں تیرے ہی بتائے ہوئے نسخے ہیں۔

اسے نہ سزا کا خوف گناہ سے باز رکھتا ہے اور نہ ہی جزا کا لالچ نیکی کی طرف کھینچتا ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہر چند غالب اپنی وسیع مشربی اور آزادہ روی میں دہریت کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اخلاقیات کا ایک ایسا بلند معیار پیش کرتا ہے کہ نیکی کے لیے جنت کی طمع اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

طاعت میں تا رہے نہ مہ وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

خلیفہ صاحب غالب کے تصور وحدت الوجود پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وحدت وجود سے جو منطقی نتائج اخذ ہو سکتے ہیں وہ سب غالب نے

اخذ کئے ہیں۔ فکر و عمل میں یہ نتائج جہاں لے جائیں وہ ادھر ہی گئے ہیں۔ لیکن اس نظریے کے ایک دوسرے رخ کی طرف بھی توجہ کرنی لازمی ہے۔ جن فلاسفہ نے وحدت وجود کے مبسوط مرتب نظامات فکر قائم کئے ہیں۔ وہ بھی اپنے افکار میں داخلی موافقت پیدا نہیں کر سکے۔ بے صفات اور غیر شخصی ہستی مطلق کے قائل ہوتے ہوئے بھی مومنوں کا عام تصور خدا ان کے ہاں ملتا ہے۔ عبادت بھی ہے اور خیر و شر کی پیکار بھی۔ نبوت کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ خدا سے مناجات بھی موجود ہے۔ تزکیہ نفس کی ریاضت بھی پائی جاتی ہے۔ غالب کے جذبات و اعمال میں تو کوئی توازن نہیں لیکن سیدھے سادے مومنوں کے عقائد کو بھی بڑی عقیدت سے پیش کرتا ہے۔ نعت اور منقبت میں جو کچھ لکھتا ہے وہ ایسا ہے کہ مومنوں کے لیے وجد آور اور تقویت ایمان کا باعث ہو سکتا ہے۔ جب خالص فلسفی سے وحدت وجود کا عقیدہ اچھی طرح نہیں نبھتا تو غالب تو بھلا شاعر ہی ٹھہرا' اس سے توافق افکار کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

(افکار غالب ص ۱۷)

مرحوم خلیفہ صاحب نے وحدت الوجود کو غالب کا اساسی نظریہ قرار دیا ہے اور اس سے برآمد ہونے والے منطقی نتائج جو مابعد الطبیعیات' اخلاقیات اور ایمانیات کے دائروں میں آئے ہیں انہیں بھی تفصیل سے بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ان میں توافق و تطابق پیدا نہیں ہو سکا۔ اسی لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فکر غالب کا تانا بانا رطب و یابس' بلند و پست' ایمان و کفر اور متانت و ابتذال کے متضاد رجحانات سے تیار ہوا ہے۔ اعلیٰ درجے کی دانش و حکمت کے کی باتوں کے ساتھ ساتھ عامیانہ پن اور اخلاقی پستی کے خیالات بھی اس کے افکار میں شامل

ہو گئے ہیں۔ چونکہ اس کے افکار میں داخلی ہم آہنگی نہیں' اس لیے وہ اسے فلسفیوں کی صف میں کھڑا نہیں کرتے۔

خلیفہ صاحب کے نزدیک فلسفی کا ایک روایتی تصور ہے جس کی رو سے اسے منطقی طور پر تضادات سے پاک ایک ایسا نظام فکر پیش کرنا چاہیے جس میں کوئی عیب یا جھول نہ ہو۔ ہیگل کے زمانے تک تو فلسفیوں کا کردار یہی رہا ہے کہ وہ روایتی سکہ بند نظام تعمیر کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہیگل کے بعد ایسی فکری تحریکوں نے فروغ پایا جن میں داخلی توافق و تطابق کو درخود اعتناء نہ سمجھا گیا۔ چند اساسی اصولوں کو اپنانے کے بعد ان تحریکوں کے پیروؤں نے اپنے اپنے انداز میں فلسفہ طرازی کی۔ ان تحریکوں میں وجودیت کی تحریک ایک ایسی تحریک ہے جس نے گویا فکر غالب کو یورپ کی فضا میں نیا جنم دیا۔ وجودیت بنیادی طور پر انسانی صورت حال (Human Predicament) سے متعلق ہے۔ انسانی فطرت میں بلندی و پستی' خوف و امید خودداری و خود شکستگی کے متضاد رجحانات ملتے ہیں اس لیے وجودیت کے فلسفے نے ان تضادات کو انسان کی بنیادی سچائیوں کے طور پر ابھارا ہے۔ اس کے علاوہ وجودیت میں انسانی آزادی' اختیار' کرب اور "کومٹ منٹ" وغیرہ پر بہت زور دیا گیا ہے یہ سب عناصر ہمیں غالب کے فکر میں بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر غالب کو ہم فلسفیوں کی صف میں کھڑا کرلیں تو یہ عین دور جدید کے تقاضوں کے مطابق ہو گا جس میں افسانہ' شعر' ڈرامہ حتی کہ فلم کو بھی فلسفہ طرازی کے ذرائع کے طور پر اپنایا جا رہا ہے۔

خلیفہ صاحب نے وحدت الوجود کے علاوہ غالب کے متعدد فکری پہلوؤں سے تعرض کیا ہے اور اس ضمن میں اس کے اردو اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی کلام سے بھی حکیمانہ اشعار کا انتخاب کرکے ان کی تشریح و توضیح کی ہے۔

ایسا کرتے ہوئے انہوں نے فلسفے کی عالمی روایت کا پس منظر برقرار رکھا ہے۔ جہاں ضروری محسوس ہوا ہے' انہوں نے فکر غالب کے ڈانڈے فلسفیانہ نظریات سے ملائے ہیں۔ مزید براں مختلف جگہوں پر فکر غالب کا تقابل مغربی فلسفوں سے بھی کیا ہے۔ غالب کے اردو کلام کی نسبت اس کے فارسی کلام کا مطالعہ اس کے فکر کی تفہیم میں زیادہ مدد دیتا ہے کیونکہ اس نے خود اپنے فارسی کلام کے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی ہے۔ اور اس میں مطالب کا اظہار بھی صاف اور منطقی انداز میں کیا گیا ہے۔

یہاں فکر غالب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں۔ جن سے خلیفہ صاحب نے بحث کی ہے۔ وحدت الوجود' آزادہ روی' اخلاقی نقطہ نظر اور وسیع المشربی کا اختصار سے جائزہ لینے کے بعد ہم یہاں فکر غالب کے ایک نہایت اہم پہلو کا ذکر کرنا ضروری ہے' جس پر خلیفہ صاحب نے خصوصیت سے روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے نظریہ حیات و کائنات کے بارے میں خلیفہ صاحب لکھتے ہیں:

"غالب کے نزدیک کائنات تمنا سے لبریز ہے جسے کبھی وہ عشق کہتا ہے اور کبھی شوق! مہر ہو یا ذرہ' سب میں زندگی اور بے تابی ہے اور چونکہ تمنا دل کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لیے از مہر تابہ ذرہ دل ہی دل ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

عشق کی جو کیفیت نفس انسانی میں پیدا ہو گئی ہے' غالب اس کے مقابلے میں اجرام فلکیہ اور افلاک کی حرکت کو سست رفتار کہتا ہے۔

(افکار غالب ص ص ۲۶۴۔ ۲۶۵)

غالب کے نزدیک تمنا کی شدت ہی وہ قوت محرکہ ہے جو غالب کو ہمیشہ

سرگرم عمل رکھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تمنا' آرزو' خواہش یا طلب ہی شجر حیات کی جڑ ہے اور اسی سے ارتقائی عمل میں سرگرمی قائم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خواہش کی ناکامی حسرت و یاس کی تکلیف وہ کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بعض فلسفوں میں خواہش کی نفی کو تمام بیماریوں کا علاج قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے داڑھ کے درد کا علاج یہ تجویز کیا جائے کہ داڑھ کو ہی نکلوادو۔ رہبانیت' بدھ مت اور اسلامی تصوف کے بعض مکاتب نے مشرق و مغرب میں اسی منفی رویے کو فروغ دیا۔ یہ فلسفے دنیائے مظاہر یا مایا کے پیدا کردہ فریب اور خواہشات کے جال سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن غالب اس منفی رویے کا قائل نہیں۔ اگرچہ وہ شکست آرزو کے چرکے اپنی روح پر محسوس کرتا ہے اور ہزار قسم کی خواہشات کے ابھرنے اور ان کے خائب و خاسر ہونے سے اس کا دل لخت لخت ہو جاتا ہے تاہم وہ خواہش کی نفی کا رویہ نہیں اپناتا بلکہ ایک خواہش کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی ایک دوسری خواہش پیدا کر لیتا ہے۔ خواہشات اور تمناؤں کا ہجوم اس کے تخیل اور وجدان کو ہمہ وقت متحرک و متلاطم رکھتا ہے۔ ذوق خرام ہی غالب کا منتہائے مقصود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی اور اس کے ہمہ دم مستعد و فعال رہنے کے ساتھ اس کی "کومٹ منٹ" (بلند مقصد سے پیمان وفا) کتنی پختہ تھی۔ ذیل کے چند اشعار اس کی اس "کومٹ منٹ" کے غماز ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو اک نقش پا پایا

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہئے

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہیں بیاباں مجھ سے

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

میں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

غالب کی ساری زندگی دکھوں اور مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ معاشی بدحالی، قرض خواہوں کے تقاضے، ازدواجی ناہمواری، زمانے کی قدر ناشناس بلکہ دشنام طرازی، بھانت بھانت کی بیماریاں، مقدمے، روحانی اذیتیں، غرض ایک جان کو ہزار روگ لگے تھے۔ لیکن اس نے کبھی بھی زندگی کے بارے میں منفی رویہ اختیار نہ کیا۔ مصائب نے اس کے اندر ایک نہایت لطیف حسی مزاح پیدا کر دی، اسی لیے حالی نے غالب کو حیوان ناطق کی بجائے حیوان ظریف قرار دیا تھا۔ دکھوں اور تکلیفوں کی شدت کو وہ بری طرح محسوس کرتا ہے اور ان کا اظہار بھی بڑے پر اثر انداز میں کرتا ہے، تاہم نہ وہ خواہش کی نفی کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہ ہی ذوق سفر سے دستبردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے افکار اور وجدان کی ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا ہے جس میں وہ ہمہ وقت

سرگرم سفر رہتا ہے۔ آلام و مصائب پر اس کی آنکھیں اشک بار ضرور ہوتی ہیں لیکن آنسوؤں کی جھل مل کے پیچھے ایک ایسی مسکراہٹ بھی نظر آتی ہے جو شمع زندگی کو سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلنے کی تلقین کرتی ہے۔ زندگی کی تحرک و تموج سے اپنی اس کومٹ منٹ (Committand) کی بنا پر ہی اسے قیس کا کردار بڑا دلکش لگتا ہے جس کا لازمی تلازمہ صحرانوردی اور آوارہ خرامی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اثبات حیات کی اسی فکری روش نے بعد میں اقبال کے تصور خودی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔